تاریخ کے جھروکے سے……

ایک بصیرت افروز خطاب

از

حضرت مولانا اسرار الحق صاحب قاسمی مدظلہ العالی

(صدر ملی کونسل و ممبر آف پارلیمنٹ)

مرتّب

محسن بن قاری یوسف راندیری

(خادم التدریس جامعہ حقانیہ کٹھور، سورت، گجرات)

ناشر

مکتبہ فاطمۃ الزہراء

(رحمت نگر سوسائٹی، راندیر، سورت، گجرات)

(موبائل: 8866668323, 8238803300)

تاریخ کے جھروکے سے......

ایک بصیرت افروز خطاب

﴿ از ﴾

حضرت مولانا اسرار الحق صاحب قاسمی مدظلہ العالی

(صدر ملی کونسل وممبر آف پارلیمنٹ)

﴿ مرتب ﴾

محسن بن قاری یوسف راندیری

(خادم الحدیث رئیس جامعہ حقانیہ کٹھور، سورت، گجرات)

﴿ ناشر ﴾

مکتبہ فاطمۃ الزہراء

(رحمت نگر سوسائٹی، راندیر، سورت، گجرات)

(موبائل 8866668323, 8238803300)

نام کتاب: تاریخ کے جھروکے سے......
ایک بصیرت افروز خطاب

از: حضرت مولانا اسرارالحق صاحب قاسمی مدظلہ العالی
(صدر ملی کونسل وممبر آف پارلیمنٹ)

مرتب: محسن بن قاری یوسف راندیری
(خادم التدریس جامعہ حقانیہ کٹھور، سورت، گجرات)

طبع اول: ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۰۱۶ء

تعداد: ۱۱۰۰

......☆......☆......☆......

......﴿کتاب ملنے کے پتے﴾......

(۱) محسن بن قاری یوسف راندیری
(جامعہ حقانیہ کٹھور، سورت، گجرات)

(۲) مکتبہ فاطمۃ الزھراء
(رحمت نگر سوسائٹی، راندیر، سورت، گجرات)

(موبائل: 8866668323, 8238803300)

عرض مرتب

حضرت مولانا اسرار الحق صاحب قاسمی دامت برکاتہم العالیہ کی ذاتِ گرامی سے کون ناواقف ہوگا۔ آپ دار العلوم دیوبند کے عظیم سپوت، حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ کے خلیفۂ مجاز، نمونۂ اسلاف، پیکرِ تواضع، دریائے علم ومعرفت کے شناور، تعلیم و ترقی کا روشن مینار، کوچۂ عشق ووفا اور درد محبت سے آشنا ہونے کے ساتھ اسلامی سیاست کا روشن ستارہ و نیر تاباں اور ممبر آف پارلیمنٹ ہیں، آپ کی آہنی ہمت وارادہ اور فولادی عزم و حوصلہ کے سامنے حکومتیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتی ہیں، آپ کی ذات سچی سیاست اور صاف ستھری و بے داغ جمہوریت کی سچی تصویر ہے، سینہ میں دھڑکتا پھڑکتا ہوا ایسا دل رکھتے ہیں جو غریبوں، مسکینوں، بیواؤں، اپاہجوں، ضرورت مندوں اور سماج کے ان پڑھ اور پچھڑے ہوئے لوگوں کے درد کو محسوس کرے، ان کا غم کھائے، ان کی اشک سوئی کرے، اور ان کے درد کا درماں اور ان کی تکلیفوں کے حل کرنے کا راستہ تلاش کرے اور اسی لیے حضرت والا دامت برکاتہم ملک بھر میں تقریباً ڈھائی لاکھ دیہاتوں کا بذاتِ خود سفر کر چکے ہیں اور دامے درمے قدمے سخنے خدمت فرما رہے ہیں اور اپنے مفید مشوروں اور خطاب و بیان سے نوازتے رہتے ہیں۔

منجملہ ان خطابات کے ایک وہ قیمتی اور سحر انگیز خطاب بھی ہے جو مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی رامت برکاتہم العالیہ کے دولت کدہ پر مختلف مدارس سے تشریف لائے ہوئے ممتاز علمائے کرام کے درمیان آپ نے فرمایا تھا، جو پوری ملت کے لیے عموماً اور علمائے کرام کے لیے خصوصاً عظیم تحفہ اور زادِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ احقر کے دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ اسے مستقل رسالے کی شکل دی جائے چنانچہ میں نے اس سلسلے میں

حضرت الاستاذ مشفقی و مربی مولانا عمران صاحب خان پوری مدظلہ العالی (استاذ حدیث دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر) سے مشورہ کیا تو آپ نے بہت ہی حوصلہ افزائی فرمائی اور مفید مشوروں سے بھی نوازا بلکہ تہذیب و تنقیح فرما کر اور تحریری شکل دے کر اشاعت کے قابل بنایا۔ احقر اس ذرہ نوازی پر حضرت والا کا نہایت ہی شکر گزار ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی شانِ کریمی سے بہترین بدلہ عنایت فرمائیں (آمین) نیز اس موقع پر احقر حضرت مولانا صادق صاحب خیر آبادی (استاذ حدیث جامعہ حقانیہ کٹھور) کا بھی شکر گزار ہے جنھوں نے عنوان سازی میں بندہ کی مدد فرمائی۔ نیز بندہ سپاس گزار ہے ان تمام حضرات کا، جن کے تعاون سے یہ رسالہ منصۂ شہود پر آیا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

تقدیر کی کرشمہ سازی سے حضرتِ والا سے اجازت اور نظرِ ثانی کا مرحلہ یوں آسان ہوگیا کہ اُسی دوران حضرتِ والا کی بذاتِ خود گجرات تشریف آوری ہوگئی تو بندہ مسوّدہ لے کر خدمتِ عالی میں حاضر ہوا اور نظرِ ثانی فرمانے کی درخواست کی۔ حضرتِ والا نے انتہائی فرحت و انبساط کا اظہار فرمایا اور حوصلہ افزائی فرمائی اور مسوّدہ اپنے ہمراہ لے گئے تا کہ اطمینان سے دیکھ سکیں۔ حضرت مولانا نے نہ صرف یہ کہ رسالہ کو بنظرِ غائر دیکھا بلکہ مزید کرم یہ فرمایا کہ عنوان کی مناسبت سے آزادیٔ ہند کی تاریخ سے متعلق وقیع اور مفید اضافہ بھی فرمایا جس سے رسالہ کی جامعیّت اور افادیت کو چار چاند لگ گئے۔

اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو ہم سب کی اصلاح کا ذریعہ بنائے اور اس کاوش کو شرفِ قبولیت بخشے، اس کے پاکیزہ اور مثبت نتائج مرتب فرمائے اور احقر کے والدین، اساتذہ اور مشائخ و دیگر معاونین کیلئے صدقۂ جاریہ اور ذریعۂ مغفرت و نجات بنائے۔ (آمین، بحرمۃ سید المرسلین)

طالبِ دعا

محسن بن قاری یوسف راندیری

خادم التدریس جامعہ حقانیہ کٹھور

۲ر صفر المظفر ۱۴۳۷ھ

الحمدلله رب العالمين، والصلوة والسلام على نبيه الكريم،
وعلى آله وأصحابه أجمعين، امابعد:

تاریخ کے ہر عہد میں اشاعتِ دین اور دفاع دین کے سلسلے میں علماءِ کرام نے بڑی قربانیاں پیش کی ہیں اور علمائے کرام کی یہ بیدار مغزی رہی ہے کہ جس عہد میں جو حالات پیش آئے ہیں ان کے تقاضوں کے مطابق انھوں نے اقدامات کیے ہیں، فیصلے کیے ہیں اور ان پر عمل درآمد کیا ہے۔ جیسے ابھی کل ہی 15 راگست گزرا، ہندوستان کی آزادی اس کی بہترین مثال ہے، یہ بات ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے علماء میں سے چاہے مجدد الف ثانیؒ ہوں چاہے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہوں ان حضرات کو حکومت و اقتدار سے کوئی مطلب نہیں تھا اور الحمدللہ یہ لوگ اس مقام کے تھے کہ بادشاہ ان کے سامنے جھکتے تھے، یہ بادشاہوں کے سامنے نہیں جھکتے تھے۔

اگر ہم انگریزوں کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ 1600ء سے 1690ء تک تک تجارت کے نام سے انگریزوں نے پورے ملک میں اپنا نیٹ ورک پھیلا دیا، مگر اورنگزیب عالمگیرؒ جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادہ خواجہ محمد معصومؒ کے تیار کردہ شخص تھے اور جو بادشاہ کم اور ولی زیادہ تھے، ان کی اتنی مضبوط گرفت تھی کہ اس وقت انگریزوں کو سازشی ذہنیت اور طاقت کے باوجود کچھ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پھر 1707ء میں اورنگزیب کا انتقال ہوا، اس کے بعد گرفت کمزور پڑگئی اور آپس میں راجہ مہاراجہ اور نواب اپنی ریاستوں کو کو خود مختار بنانے کی جنگ میں مصروف ہو گئے تو یہ تجارت پیشہ لوگ ملک میں سیاسی دخل اندازی شروع کرنے لگے اور ملک کو کمزور کرنے میں لگ گئے۔ ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کو پھیلانے کے لیے پادریوں کو بلا کر مختلف جہتوں میں کام شروع کر دیا، 1707ء میں اورنگزیبؒ کا انتقال ہوا اور اس سے تین چار سال پہلے ہی 1703ء میں اللہ تعالیٰ نے شاہ ولی اللہؒ کو پیدا کر دیا اور آپ

1731ء تک ظاہر و باطن کے تمام علوم سے آراستہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سارے علوم پر دسترس کے ساتھ ساتھ نعمتِ تقویٰ سے بھی نوازا تھا بلکہ اتنا بڑا مقام عطا فرمایا تھا کہ ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پوری دنیا میں رموزِ شریعت کا علم جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا تھا، وہ کسی کو عطا نہیں کیا، یہ ہمارے لیے فخر کی بھی بات ہے اور خوشی کی بھی۔ بہر حال حضرت شاہ ولی اللہؒ نے 1731ء کے بعد محسوس کیا کہ یہ انگریز ہم کو غلام بھی بنائیں گے اور غلام بنانے کے بعد ہمارا مذہب بھی ہم سے چھین لیں گے، اس لیے علمی و عملی طور پر زبردست تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ یہ احساس وادراک اللہ تعالیٰ نے آپ کو شروع ہی میں کرادیا تھا، اس سلسلے میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے عجیب بات لکھی ہے کہ اس ملک میں اسلام کا وجود منشاءِ الٰہی ہے اور میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ یہ حضرت کا الہامی جملہ ہے۔

آزادی کی جنگ اور تحریکِ ولی اللّٰہی کے اثرات:

ہندوستان کی جنگ آزادی میں ملک کے تمام طبقات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تاہم مسلمانوں نے جنگ آزادی میں جس جذبہ وولولہ کے ساتھ شرکت کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے 1757ء سے 1947ء تک کئی محاذوں پر انگریزوں کے پاؤں اکھاڑ ڈالے۔ 1857ء میں انہوں نے دہلی سے انگریزوں کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کا ایسا کوئی گوشہ نہیں جہاں مسلمانوں نے جدوجہدِ آزادی کے سلسلہ میں اپنا کوئی نقش نہ چھوڑا ہو۔ خاص طور سے تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں علماء نے جو قائدانہ کردار ادا کیا اسے تاریخ ہند کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ آزادی کے بعد ملک میں کئی شدت پسند جماعتیں آزادی کے تعلق سے علماء کرام کی قربانیوں کو دبانے میں سرگرم عمل رہی ہیں۔ یہاں تک کہ آزادی کے عنوان سے لکھی جانے والی کتنی ہی کتابوں میں ان مجاہدین علماء کا یا تو نام ہی نہیں ہے یا کہیں ان میں سے بعض کا ہلکا سا تذکرہ کردیا گیا ہے جنہوں نے جنگ آزادی کے ہر موڑ پر باشندگان ہند کی رہنمائی کی۔

سترھویں صدی کے اوائل میں ہی انگریزوں نے ہندوسان میں قدم رکھ دیے تھے، مگر اس وقت کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ تجارت کی آڑ میں ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ابتداءً جس برق رفتاری کے ساتھ انہوں نے تجارت کے میدان میں ترقی کی۔ اس سے بظاہر یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہندوستان میں محض اقتصادی سطح پر ترقی کے خواہش مند ہیں۔ 1613ء میں جیسے ہی شہنشاہ جہانگیر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ملک میں تجارت کے مقصد کے تحت فیکٹریاں قائم کرنے کی اجازت دی۔ ویسے ہی یکے بعد دیگرے ان کی فیکٹریاں جگہ جگہ قائم ہونے لگیں۔ صرف تین سال کے قلیل عرصہ میں انہوں نے آگرہ، احمد آباد، سورت، بھروچ اور بڑودہ میں فیکٹریاں بنالیں۔ اس کے بعد تیزی کے ساتھ وہ تجارت کے میدان میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ سترھویں صدی کے وسط تک انہوں نے ہندوستانی کمپنیوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ لیکن ابھی تک ہندوستانیوں کو ان کے اس ارادہ کا علم نہ ہوا کہ وہ ملک کو غلام بنانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ 1707ء میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد جب ملک کے حالات خراب ہوئے اور اس طرح اٹھارہویں صدی کے وسط میں مغل بادشاہ کمزور ہو گئے اور انگریزوں کے قدم جمنے لگے، ملک میں افراتفری پھیلنے لگی ،تو ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کے محرک اول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے 1731ء سے ہی انگریزی استعماریت کے خلاف ہندوستانیوں کی ذہن سازی کا سلسلہ شروع کردیا۔ شاہ صاحب نے ایک منظم پروگرام بنایا۔ سب سے پہلے عوامی بیداری پر توجہ مبذول کی۔ پھر ایک ایسی جماعت تیار کرنے کا منصوبہ بنایا جو رجالِ کار پر مشتمل ہو اور جس کے ذریعہ کام لیا جائے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے لکھا ہے کہ:

''حکیم الہند نے اپنے پروگرام کی تدوین کے ساتھ ساتھ رفقاء کی مرکزی جماعت بھی تیار کی جو تعلیم وارشاد کے ذریعہ اس انقلابی تحریک کی اشاعت ایک طرف صوفیاء اور علماء میں اور دوسری طرف امراء اور سرداران سلطنت میں کرتی رہی۔ ان میں مولانا محمد عاشق پھلتی، مولوی نوراللہ بڈھانوی اور مولانا محمد امین کشمیری خاص

طور پر مشہور ہیں۔ نیز آپ نے اطراف ملک میں اس مرکزی جمعیت کی شاخیں بھی قائم کرائیں۔ نجیب الدولہ کا قائم کردہ نجیب آباد کا مدرسہ، رائے بریلی میں دائرہ شاہ علم اللہ، حکیم الہند کی مرکزی تحریک کے مرکز تھے، سندھ میں ملا محمد معین کا مدرسہ ٹھٹھ بھی ان کا ایک مرکز تھا۔"

حضرت شاہ ولی اللہؒ انگریزی خطرہ کو پوری طرح سمجھتے تھے۔ وہ ملک سے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی بالادستی کو ختم کر کے، مطلق العنان بادشاہت واپس لانا نہیں چاہتے تھے، بلکہ ایک آزاد اور پر امن اسٹیٹ کا قیام ان کے پیش نظر تھا، جہاں انصاف کو بالادستی حاصل ہو، ہر طرح کے ظلم کا خاتمہ ہو اور ہر شخص کو خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اس کا مذہبی، ملکی اور معاشرتی حق پورا پورا ملے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو غیر مسلموں کے امن وامان کا کتنا خیال تھا اور اس کے لئے وہ کتنے فکرمند تھے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ان کے ایک خط کا فقرہ نقل کرنا کافی ہے جو انہوں نے نجیب الدولہ کو لکھا تھا کہ: یعنی اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ یہ مشکل آسان ہو جائے تو پوری پوری تاکید کرنی چاہئے کہ کوئی فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے ہرگز تعارض نہ کرے۔ (سیاسی مکتوبات) مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ فقرہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے نظریہ "قومیت" کی تعمیر میں بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ مطلق العنان بادشاہت واپس لانا نہیں چاہتے تھے جیسا کہ پروفیسر محمد سرور نے مولانا عبید اللہ سندھی کے خیالات کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: "شاہ صاحبؒ نے خوب سمجھ لیا تھا کہ شہنشاہیت کا دور ختم ہو چکا۔ اب اگر کوئی حکومت بنے گی تو اس کی بنیاد دوسری ہوگی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے جس تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی وہ ہمہ گیر تحریک تھی۔ ان کے پیش نظر پورا ہندوستان تھا، چونکہ مرکزی ہندوستان کی قیادت اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی اس لئے لامحالہ شاہ صاحب نے عام مسلمانوں سے خطاب کیا لیکن شاہ صاحب کی دعوت کے اصول عام انسانیت کے اصول تھے، ان

کا زور مذہب کی رسوم پر نہیں بلکہ مذہب کی روح پر تھا، قانون کی ظاہری شکل پر نہیں قانون کی جان یعنی عدل وانصاف پر تھا۔ شاہ صاحب اپنے مجوزہ نظام میں اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانے کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اس طرح کے مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے انصاف کی حکمرانی ہو''۔ (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۲۶۔۲۹ پر دیکھئے)

حضرت شاہ ولی اللہؒ انگریزوں کی ڈپلومیسی سے خوب واقف تھے۔ اس لئے انہوں نے جو نظام مرتب کیا تھا اس نے پورے ملک میں آزادی کی روح پھونک دی تھی۔ اسرار احمد آزاد لکھتے ہیں: ''پلاسی کی لڑائی سے بہت پہلے حضرت شاہ صاحب کی تحریک کے داعی ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکے تھے اور انہوں نے قریہ قریہ پہنچ کر لوگوں کے دلوں میں بدیشی اقتدار کی مخالفت اور ہندوستان کی مرکزی حکومت کی بقاو حفاظت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔'' (ماہنامہ آج کل دہلی شمارہ اگست 1957، جنگ آزادی نمبر ۷)

انگریزی سیاست کی شاطرانہ چالیں اور ان کے بڑھتے قدم شاہ صاحبؒ کے دل ودماغ پر تیشے چلا رہے تھے انہیں ملک میں مسلمانوں کا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا، قوم کی تقدیر ان پر واضح ہو چکی تھی۔ لیکن ان کے زمانہ میں دہلی پر انگریزوں کا غلبہ نہیں ہوا تھا اور حالات اتنے سنگین نہیں ہوئے تھے کہ حضرت شاہ صاحب انگریزوں کے خلاف عملی جدوجہد کا آغاز کرتے تاہم انہوں نے ملک کو اخلاقی، معاشرتی، اور سیاسی انتشار سے بچانے کے لئے ایک مستقل انقلابی تحریک کا آغاز کر دیا تھا جو ہندوستان کی طویل جنگ آزادی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ان کے جانشین اور نامور صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے 1803ء میں انگریزی حکومت کے خلاف مشہور فتویٰ جاری کیا اور اپنے والد کی فکری کوششوں کو عملی شکل دیتے ہوئے حضرت سید احمد شہیدؒ کو لبریشن مومنٹ کا قائد مقرر کیا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ نے حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے ساتھ تحریک مجاہدین

کا آغاز دہلی کی مسجد اکبر آبادی سے کیا، جسے انگریزوں نے 1857ء کی جنگ کے دوران زمین دوز کر دیا۔ بالاکوٹ میں 1831ء کو حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے ہزاروں مجاہدین کے ہمراہ انگریزوں کے خلاف جنگ میں جام شہادت نوش کیا۔

برطانوی استعمار کے خلاف 250 سالہ جدوجہد میں سرزمین ہند کی فضائیں مسلمانوں بالخصوص علماء کی قربانیوں سے معمور رہی ہیں اس طویل جنگ آزادی کے دوران انہوں نے جو جانی و مالی قربانیاں دیں اگرچہ ان کا کوئی ریکارڈ یکجا نہیں ہے اور نہ اس پر کوئی خصوصی تحقیقی کام ہوا ہے۔ تاہم یہ تاریخی سچائی ہے کہ جنگ آزادی کے دوران علماء اور مسلمانوں نے جو بے مثال اور بے لوث قربانیاں دی ہیں، چاہے کوئی ان کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی بدولت آج آزادی کی 150 ویں سالگرہ کی تقریبات کے دوران ہر ہندوستانی مسلمان شہری کا سر اونچا ہے۔ اور ان قربانیوں کے تذکرے کے بغیر تاریخ آزادی ادھوری ہے۔

1831ء میں بالاکوٹ میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت اسماعیل شہیدؒ کی شہادت کے بعد ان کے رفقاء کار خصوصاً مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی نے اس تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ پنجاب سے نکالے جانے کے بعد یہ حضرات بنگال کے راج شاہی علاقہ میں پہنچ گئے اور وہاں سے انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ جہاں بنگال میں یہ آگ لگی ہوئی تھی وہاں ملک کے دوسرے حصے اس سے محروم نہیں تھے۔ پٹنہ کا صادق پور بھی ایک بڑا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں سے ملک بھر میں سرگرمیوں کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ بھی اس کی زد سے باہر نہیں تھا صادق پور کا پورا نظم علماء کرام کے ہاتھوں میں تھا۔ مولانا غلام رسول صاحب کی کتاب "سرگذشت مجاہدین" کے مطابق علماء کرام کے اس جہاد آزادی میں تقریباً 1500 مجاہدین شہید ہوئے۔ ان میں ملا لال محمد قندھاری اور مولوی مظہر علی عظیم آبادی جیسے معروف علماء کرام تھے۔ پھر 1838ء میں جنگ ٹوپی کے دوران مولانا نصیر الدین منگلوری کے

علاوہ سینکڑوں افراد جاں بحق ہوئے۔

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے دہلی میں چنگیز وہلاکو خاں کی داستانیں دہرادیں۔ لارڈ لابرٹ کی کتاب ''ہندوستان میں 41 سال'' اور قیصر التواریخ جلد دوم کے مطابق تقریباً 27 ہزار مسلمان اس میں شہید ہوئے جن میں علماء کی معتد بہ تعداد تھی۔ 1864ء اور 1871ء کے درمیان پانچ اہم STATE TRIALS ہوئے جن کے تحت متعدد افراد کو پھانسی اور عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ موت کی سزا پانے والوں میں مولانا یحیی علی، مولانا محمد جعفر تھانیسری اور لاہور کے محمد شفیع تھے۔ لیکن جب ان مجاہدین نے سزائے موت کو پیام شہادت کے طور پر لبیک کہا تب برطانوی حکومت نے یہ کہتے ہوئے کہ ''جو سزا تمہیں عزیز ہے اور باعث مسرت ہے اسے ہم تبدیل کرتے ہیں'' سزائے عمر قید میں بدل دیا۔ ان سبھوں کو انڈمان نکوبار (کالاپانی) بھیج دیا گیا۔ وہاں ان کے علاوہ کئی سو افراد مزید بھیجے گئے، ان میں مولانا احمد اللہ عظیم آبادی، مولانا عبدالرحیم صادق پور، علامہ فضل خیر آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مفتی مظہر کریم دریا آبادی جیسے معروف اور جلیل القدر علماء شامل تھے۔ حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی جہاد وحریت کے علمبردار حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔ ان کو ان کے آبائی وطن سیتاپورے سے 1859ء کو گرفتار کیا گیا ہندوستان کے کئی جیلوں میں رکھا گیا آخر میں انہیں بھی کالاپانی بھیج دیا گیا۔ جہاں 1861ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اسی طرح مولانا احمد اللہ فیض آبادی کو اودھ میں سازش کرنے کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔ باغی میرٹھ رجمنٹ کے کمانڈر مولانا لیاقت علی خاں اور دہلی اردو اخبار کے مدیر مولانا باقر دہلوی کو انتہائی بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ دراصل شاطر انگریز جانتے تھے کہ ہندوستان میں علماء ہی ان کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ ان کے پاس حوصلہ وجذبہ ہے، ان کی سوچ انتہائی بلند ہے اور وہ غلامی کی زندگی کو برداشت نہیں کرسکتے۔

1857ء کی جنگ آزادی میں علماء لدھیانہ نے بھی جم کر حصہ لیا، ان مجاہدین علماء میں شاہ عبدالقادر لدھیانوی سرفہرست تھے وہ اپنے زمانہ کے برگزیدہ عالم اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے مشہور مشائخ میں تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں اور رفقاء کار کے ساتھ برطانوی فوج سے مقابلہ کیا یہ لوگ انگریزوں سے لڑتے ہوئے دہلی پہنچے ان کے ساتھ عورتیں اور بچے بھی تھے۔ فتحپوری سے لے کر لال قلعہ تک شاہ عبدالقادر کی قیادت میں مجاہدین نے انگریزی فوجی دستوں سے دست بدست جنگ کی۔

علماء کرام نے ہر جگہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پیغام آزادی کا نہ صرف زبردست استقبال کیا بلکہ اسے عملی جامہ پنانے کے لئے غیر معمولی قربانیاں دیں۔ علماء صادق پور نے جدوجہد آزادی میں 1735ء سے 1835ء تک تاریخی کردار ادا کیا جس کو آزادی کی تاریخ میں ''وہابی مومنٹ'' کا نام دیا گیا۔ 1857ء میں انگریزوں کے خلاف جو جنگ لڑی گئی اس میں بھی وہابی تحریک کا اہم رول تھا۔ وہابی تحریک نے اپنا مرکز میرٹھ میں بھی قائم کیا تھا۔ مجاہد آزادی احمد (معروف بہ مولوی فیض آبادی) نے 1856ء میں میرٹھ کا دورہ کیا۔ اپریل 1857ء میں عظیم اللہ خاں اور نانا تھو پنت جنگ کی تیاری کا معائنہ کرنے کے لئے میرٹھ آئے۔ ان حضرات نے انگریزی حکومت کے خلاف پورے ملک میں جنگ شروع کرنے کی تاریخ 31/مئی 1857ء بتائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پورے ملک میں اس جنگ کے لئے خفیہ طور پر بڑے پیمانہ پر تیاری کر لی گئی تھی۔ لیکن یہ جنگ متعینہ تاریخ سے پہلے 10/مئی 1857ء ہی کو شروع ہوگئی۔

متعینہ تاریخ سے قبل ہی جنگ کے آغاز کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے کہ ہندوستان کے وہ فوجی جو انگریزوں کی فوج میں شامل تھے، ان کو ایسے کارتوس دیئے جاتے تھے جن کو منہ سے کھولنا پڑتا تھا اور اس پر سور اور گائے کی چربی لگی ہوتی تھی۔ جب ہندوستانی فوجیوں کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے ان کارتوسوں کے استعمال سے گریز کیا۔ 24/اپریل 1857ء کو پیر علی اور قدرت علی کی قیادت میں 85 گھوڑ سواروں نے

چربی والے کارتوسوں کو چھونے سے انکار کردیا۔ انگریزی حکام سخت برہم ہوئے اور سزا کے طور پر انکار کرنے والے فوجیوں کا زبردست مارشل کیااور 10 سال تک کی سزا سنائی۔ 9رمئی 1857ء کو پیر علی اور قدرت علی سمیت درجنوں ہندوستانی فوجیوں کو پریڈ میدان میں لایا گیا،ان کی وردی اتاری گئی اور سب کے سامنے ان کو بیڑیاں پہنائی گئیں۔

ہندوستانی فوجیوں کی اس شرمناک بے عزتی پر وہابی مرکز کی جانب سے ایک فتوی جاری کیا گیا،جس میں ہندوستانی فوجیوں سے بغاوت کرنے کی اپیل کی گئی۔ اگلے دن صبح کو بہت سے علماء نے جہاد چھیڑنے اور گرفتار شدہ فوجیوں کو چھڑانے کا حکم دیا۔ دوپہر تک پورے شہر میں یہ خبر عام ہوگئی کہ ہندوستانی فوجی بغاوت کرنے والے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ مثلاً یورپین فوجیں ہندوستانی فوجیوں کو ننگا کرنے آرہی ہیں، کبھی ہندوستانی فوجیوں نے بغاوت کردی ہے، یورپینوں کو مارا جارہا ہے۔ اس سے بازاروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ حالانکہ اس وقت تک کوئی بغاوت شروع نہیں ہوئی تھی۔ شام کو ساڑھے پانچ بجے پیدل فوج کی کمان کے افسر کے پاس یہ اطلاع پہنچی کہ فوجیوں نے بغاوت کردی۔ اس خبر کو سنتے ہی وہ وردی پہن کر بغیر ہتھیار لئے پیدل گراؤنڈ پر پہنچا۔ اس اثناء میں بغاوت کی خبر سن کر دوسرے انگریز افسران بھی وہاں جمع ہوگئے۔ کچھ دیر بعد کرنل فنیشن فوجیوں کو یہ بتلا رہا تھا کہ یورپین فوجی ان کے ہتھیار چھیننے نہیں آرہے ہیں اور کارتوس بھی وہی پرانے ہیں، جنہیں گھی سے چکنا کیا گیا ہے، ہندوستانی فوج کرنل فنیشن کی باتوں میں آگئی اور بغاوت سے پیچھے ہٹنے لگی۔

یہ وقت انتہائی اہم تھا اگر اس وقت بغاوت ٹل جاتی تو بغاوت کا وہ منصوبہ ناکام ہوجاتا جو مہینوں یا سالوں سے بنایا جارہا تھا۔ نہ میرٹھ میں بغاوت ہوتی، نہ دہلی میں اور نہ دیگر علاقوں میں، کیونکہ بغاوت کی تاریخ 31رمئی ابھی بہت دور تھی، اتنے وقت میں انگریزی حکومت ہوشیار ہوجاتی اور وہ ملکی سطح پر ہونے والی بغاوت کو ناکام بنانے کے لئے

پوری جدوجہد کرتی۔ بدلتے حالات کو دیکھ کر شیخ امیر اللہ اور قادر بخش نے اپنے ساتھیوں کو ہوا میں گولی چلانے کو کہا، فائرنگ کی آواز سن کر کرنل فینشن بغیر ہتھیار لئے 20ویں پلٹن کی طرف آ گیا، جہاں سے گولیاں چلی تھیں، ایک بار پھر اس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ بغاوت کے ہیرو شیخ امیر اللہ اور قادر بخش کو اس کی یہ چال سمجھنے میں دیر نہ لگی، انہوں نے حالات کا مزید انتظار کئے بغیر کرنل فینشن پر گولیاں چلادیں اور وہ آن کی آن میں ڈھیر ہو گیا۔ کرنل فینشن کا مارا جانا تھا کہ ماحول ہی بدل گیا، گولیاں چلنے لگیں اور کئی انگریزی افسران ہلاک کر دیئے گئے۔ قریب 40 انگریز مار ڈالے گئے اور 720 گرفتار فوجیوں کو چھڑا لیا گیا۔

غور کیجئے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کی شروعات کس طرح ہوئی اور اس کی شروعات کس نے کی؟ میرٹھ میں جب انگریزوں کو پسپا کر دیا گیا تو میرٹھ کے وہ لوگ جنہوں نے بغاوت کا علم بلند کیا تھا اسی رات گھوڑوں، اونٹوں، ہاتھیوں اور گاڑیوں پر سوار ہو کر دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں جو بستیاں آتیں، وہاں ان کا استقبال کیا جاتا اور ان بستیوں کے کچھ نہ کچھ لوگ ان کے ساتھ ہوتے جاتے، دہلی پہنچتے پہنچتے انگریزوں کے خلاف برسرپیکار ہونے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی۔ دہلی میں قدرے مزاحمت کے بعد 11/مئی 1857ء کی دوپہر تک میرٹھ اور دہلی کے فوجی لال قلعہ میں داخل ہو گئے اور بہادر شاہ ظفر سے فوج کی کمان سنبھالنے کی درخواست کی گئی۔

دہلی اور میرٹھ کی خبریں ملک کے دیگر حصوں اور فوجی چھاؤنیوں میں بھی پہنچیں جس کے بعد جگہ جگہ بغاوت شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے دہلی اور اس کے گردونواح کے علاقوں کو اپنے ہاتھوں سے نکلتا دیکھ کر ملک کے دیگر حصوں سے اپنی فوجیں بلالیں تا کہ وہ دہلی پر دوبارہ قبضہ کر سکیں۔ لیکن اس وقت ملک کے عظیم مجاہد جنرل بخت کی فوجوں نے اہم کردار ادا کیا۔ مگر افسوس کچھ وجوہات کی بنیاد پر جنرل بخت کی فوجیں 19/ستمبر 1857ء کو شکست سے دوچار ہو گئیں اور انگریزوں کا دہلی پر دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ 1857ء

کی اس جنگ کو اس لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ ملک کے متعدد علاقوں میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں بھی طبقات نے بلا تفریق مذہب وملت حصہ لیا۔

فکر ولی اللہ کے علمبردار علماء دیو بند نے جنگ آزادی میں نہ صرف زبردست قربانیاں دیں بلکہ انہوں نے ملک کی آزادی میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ دارالعلوم دیو بند کے بانی حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے 1857ء کی جنگ آزادی میں 14 ستمبر 1857ء کو بہ نفس نفیس حصہ لیا اور اپنے رفقاء حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت ضامن شہید اور حضرت مولانا منیر الدین کے ساتھ مل کر شاملی ضلع مظفر نگر میں اپنی بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھائے اور انگریزوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی قیادت میں یہ جنگ لڑی گئی اس میں حضرت ضامن شہید اور بہت سے مجاہدین شہید ہو گئے۔ مگر بدقسمتی سے اس وقت کے سیاسی حالات نے انہیں شاملی سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا مگر ان کے قائم کردہ مدرسہ دارالعلوم دیو بند کی کوکھ سے بڑے بڑے مجاہد آزادی تیار ہوئے جنہوں نے جنگ آزادی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ انہیں عظیم مجاہدین میں سے ایک تھے۔ انہوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے تحریک ''ریشمی رومال'' شروع کی جو خفیہ اور بہت منظّم تحریک تھی۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے انہوں نے خود حجاز مقدس کا سفر کیا اور اپنے قریبی ساتھیوں کو بیرون ملک روانہ کیا۔ قریب تھا کہ اس کا کوئی بہتر نتیجہ نکلتا، اس خفیہ تحریک کا انکشاف ہو گیا۔ حضرت شیخ الہند کو گرفتار کر لیا گیا اور مالٹا بھیج دیا گیا۔ جب آپ وہاں سے رہا ہو کر ہندوستان آئے تو بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے ملک میں چلنے والی تحریکوں کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑے رکھا اور ان میں آزادی کی روح پھونک کر 1921ء میں اس دار فانی سے رخت سفر باندھ لیا۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے بھی حضرت شیخ الہندؒ کے نقش قدم پر چلنے کا عزم مصمم کیا۔ شیخ الہندؒ کی تحریک کو فروغ دینے کے لئے وہ افغانستان چلے گئے۔ انہوں نے کابل

میں کانگریس کمیٹی قائم کی اور انڈین نیشنل کانگریس سے اس کا الحاق کیا۔ افغانستان میں راجہ مہندر پرتاپ کی سربراہی میں جو آزاد حکومت قائم ہوئی وہ اس کے بھی اہم رکن تھے۔ مولانا منصور انصاری بھی حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کے اہم رکن تھے۔ وہ حضرت شیخ الہند کے آخری سفر حج 1915ء میں شریک سفر تھے۔ ان کو داغستان کے علاقہ میں بھیجا گیا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے بعد وہ افغانستان چلے گئے۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی خواہش تھی کہ ہندستان کے آزاد ہوتے ہی وہ مولانا منصور انصاری کو ہندوستان بلالیں گے۔ لیکن 1946ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ جس ملک کی آزادی کے لئے انہوں نے 31 سال جلاوطنی کی زندگی گذاری تھی، اسے نہ دیکھ سکے۔ (تاریخ دارالعلوم جلد دوم)

تحریک آزادی کا اہم عنوان شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی بھی تھے۔ آپ حضرت شیخ الہندؒ کے ان رفقاء میں شامل تھے جن کو حجاز میں گرفتار کیا گیا اور جو مالٹا میں جنگی قیدی کی حیثیت سے رہے۔ 1920ء میں مالٹا سے رہائی کے بعد پورے جوش وخروش کے ساتھ تحریک آزادی کو آگے بڑھایا، جیل خانوں کو آباد کیا اور اپنے جذبہ وحوصلہ سے انگریزوں کو چنے چبوا دیئے۔ آپ اس وقت تک آزادی کی جدوجہد کرتے رہے۔ جب تک کہ ملک آزاد نہیں ہوگیا۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید اور مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاری آزادی کے ان متوالوں میں سے تھے جنہوں نے تحریک آزادی کی قیادت کی اور بڑے بڑے لیڈران پیدا کئے۔

مولانا محمد علی جوہر نے تحریک آزادی کو فروغ دینے کے لئے ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ'' نامی اخبارات نکالے، جنہوں نے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف باشندگان ہند کو اشتعال دلایا اور انگریزوں سے ٹکر لینے کے لئے تیار کیا۔ بعد میں انگریزی حکومت نے ان دونوں اخباروں پر پابندی لگادی۔ مولانا محمد علی جوہر نے تحریک خلافت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ جیل بھی گئے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے آزادی کی تحریک میں زبردست مجاہدانہ اور قائدانہ کردار

ادا کیا۔ اپنی پر مغز اور جوشیلی تقریروں سے آزادی کی فضا قائم کی۔ انہوں نے ''الہلال'' نکالا جس کے ذریعہ اہل وطن کو بیدار کیا، قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں۔ قدرت نے انہیں قیادت کی فطری صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ انہوں نے جدو جہد آزادی کے مختلف مرحلوں میں گاندھی جی، انڈین نیشنل کانگریس اور ہندوستانی قوم کو رہنمایانہ خطوط دیئے اور قومی قیادت کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ مولانا آزاد نے آزادی کے بعد بھی ملک اور اہل ملک کی بڑے پیمانے پر خدمت کی، خاص طور پر تعلیم کے میدان میں انقلابی کارنامے انجام دیے۔

تاریخ جنگ آزادی کا مطالعہ کرتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ مذکورہ شخصیتوں کے علاوہ بھی کئی بڑے نام ہیں جن کے تذکرے کے بغیر جنگ آزادی کی تاریخ ادھوری ہے۔ ابتداءً شمالی ہندوستان میں انگریزوں نے کولکاتہ میں فورٹ ولیم تعمیر کر کے اپنا مرکز بنایا تو اس وقت کے نواب بنگال علی وردی خاں نے اس خطرہ کو محسوس کرلیا اور 1754ء میں فورٹ ولیم پر حملہ کر کے انگریزیوں کو بھگا دیا۔ انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ آزادی کا نقطہ آغاز بنگال کے نواب سراج الدولہ تھے مگر بعض غداروں کی غداری کی وجہ سے انہیں 23/جون 1757ء کو پلاسی کے میدان میں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ 1764ء میں بکسر کی جنگ پیش آئی جس میں نواب شجاع الدولہ اور میر قاسم کی فوجوں نے خونریز جنگ کی اور ہزاروں کی تعداد میں شہید ہوئے۔ نواب روہیل کھنڈ حافظ رحمت خاں نے بریلی میں 1774ء کو انگریزوں سے دست بدست جنگ جس میں وہ اور ان کے رفقاء بڑی تعداد میں شہید ہوئے ان میں ممتاز علماء کرام بھی شریک تھے۔ حافظ صاحب کا سلسلۂ علم حضرت شاہ ولی اللہؒ سے جڑا ہوا ہے۔ 1776ء میں مجنوں شاہ نے کمانڈر کیتھ کو شکست دی اور 1786ء میں اس نے ''لفٹیننٹ' برنیان کی فوج پر حملہ کیا جس میں اسے گہرے زخم آئے اور چند ماہ کے بعد آزادی کے اس متوالے نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اسی دوران جنوبی ہند کے ایک عظیم مجاہد آزادی نواب حیدر علی نے 1767ء میں انگریزوں سے سخت جنگ کی۔ حیدر علی اور انگریزوں کے درمیان دوسری جنگ 1780ء کی دہائی

میں ہوئی۔ جس میں حیدر علی نے ملک دشمن انگریزوں کو سخت ٹکر دی۔ حیدر علی کی وفات کے بعد اس کے ہونہار اور حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار بیٹے ٹیپو سلطان نے کمان سنبھالی اور 1791ء میں انگریزوں سے سخت جنگ کی۔ انہوں نے جنگ آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ملک کے نوابوں اور راجاؤں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر ان حکمرانوں نے اپنے ذاتی مفادات کے سبب کوئی توجہ نہیں دی۔ یہ دیکھتے ہوئے ٹیپو سلطان نے 85-1784ء میں اپنا نمائندہ ترکی روانہ کیا۔ 1796ء میں انہوں نے افغانستان کے بادشاہ شاہ زمان کو بھی مدد کے لئے ہندوستان بلایا، اس عرصہ میں فرانس سے بھی رابطہ قائم کیا۔ لیکن بیرون ممالک سے ان کو کوئی مدد نہیں مل سکی۔ بالآخر آزادی کا یہ عظیم مجاہد 1799ء میں انگریزوں سے دست بدست لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد اب بقیہ ملک پر انگریزوں کا قبضہ کرنا آسان ہو گیا۔ چنانچہ بہت قلیل مدت میں انہوں نے ہندوستان کی بقیہ ریاستوں پر قبضہ جمالیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ 1750ء اور 1800ء کے درمیان کا وقت انگریزوں کی زبردست فتوحات کا زمانہ ہے۔ مگر یہ حکمران خاص طور پر نواب سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو ایسے عظیم مجاہدین آزادی تھے جنہوں نے شمال مشرقی اور جنوب مغربی ہندوستان میں برطانوی سامراجیت کے بڑھتے سیلاب کو اپنے لاشوں کی دیواروں سے روکنے کی کوشش کی۔ 1856ء کی جنگ اودھ میں شیر دل خاتون بیگم حضرت محل نے نہ صرف اپنی حکومت کھودی بلکہ پوری زندگی در بدری میں گذار دی۔

جنگ آزادی کی تاریخ میں یہ تو بڑے بڑے نام ہیں، جن میں عظیم اللہ خاں، رحمت اللہ سیانی، بدرالدین طیب جی، مولانا برکت اللہ بھوپالی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، حسن امام، خان عبدالغفار خاں، مولانا مظہر الحق، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ملا جان محمد، سید بدرالدجیٰ، ڈاکٹر سید محمود اور شفیع داودی جیسی شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ ان رہنماؤں کے علاوہ جنگ آزادی میں عام مسلمانوں نے بھی نمایاں رول ادا کیا ہے اور جہاں تک جان کی قربانی کا سوال ہے تو 1831ء میں

بالاکوٹ کے میدان میں، 1857ء کی جنگ آزادی میں 1919ء میں جلیانوالہ باغ میں 1920-22ء کے دوران تحریک 'عدم تعاون' میں۔ 1921ء میں موپلا بغاوت میں، 1922ء میں چوراچوری پولس فائرنگ میں، 1930 میں تحریک سول نافرمانی ونمک آندولن میں، 1942ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک میں 1942-46ء کے دوران آزاد ہند فوج اور 1946ء میں ممبئی میں بحری بیڑے کی بغاوت کی حمایت میں ہونے والے مظاہروں پر پولس فائرنگ کے دوران ہزاروں مسلمان شہید ہوئے۔ یہ وہ شہداء ہیں جن کا نام تاریخ کی اوراق گردانی میں تو ملتا ہے۔ لیکن سرکاری یا غیر سرکاری طور پر اس کا اعتراف کہیں نہیں کیا جاتا۔

اشاعت ودفاعِ دین کے لیے اسوۂ نبوی ﷺ

اب ملک ومذہب کو بچانے کے لیے ہمارا طریقہ کیا ہونا چاہیے تو ظاہر ہے کہ ہمارا طریقہ وہی ہوگا جو طریقہ رسولِ پاک ﷺ نے اختیار فرمایا تھا، چنانچہ جب فاران کی چوٹی پر کھڑے ہوکر رسول پاک ﷺ نے **لا إله إلا الله محمد رسول الله** کا اعلان فرمایا تھا، تو مجمع کی طرف سے دو قسم کے ردِعمل سامنے آئے تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ اب انسانیت بچ جائے گی اور یہ ردِعمل حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تھا اور دوسرا ردِعمل یہ سامنے آیا تھا کہ ایک شخص پاگلوں کی طرح کھڑا ہوا، کنکریاں اٹھائیں، دوڑا ہوا آیا اور آپ کے چہرۂ مبارک پر زور سے پھینکیں اور رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے کہا "**تبالک، ألهذا جمعتنا؟**" تو ہلاک ہو، کیا اسی لیے ہمیں جمع کیا تھا (نعوذ باللہ) یہ ردعمل ابولہب کا تھا، بہر حال دو قسم کے ردعمل سامنے آئے تھے، ایک خیر کا اور دوسرا شر کا، حضور ﷺ نے ان دونوں ردِعمل کی جانب ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو متوجہ کیا اور اسی لیے یہ نہیں ہوا کہ مسجد کو آباد کرنے کی کوشش تو ہوئی ہو لیکن مسجد کو توڑنے والی طاقت کو دبانے کی کوشش نہ ہوئی ہو، جی! مسجد کو آباد کرنے کی بھی کوشش ہوئی اور مسجد کو بچانے کی بھی کوشش ہوئی، امر بالمعروف بھی ہوا اور

نہی عن المنکر بھی ہوئی اور نبی پاک ﷺ نے اس کام کے لیے سب سے پہلے افراد سازی فرمائی، کیوں کہ سب کاموں سے پہلے ہمیں افراد چاہیے، چنانچہ آپ نے صحابہؓ کی جماعت تیار کی۔

تحفظِ ملک وملت کے لیے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مؤثر حکمتِ عملی

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے سوچا کہ اس ملک کو ہمیں بچانا ہے، کیوں کہ یہ وہ ملک ہے جہاں پہلا پیغمبر آیا ہے، یہ ملک وہ ملک ہے جہاں پہلی وحی آئی ہے، یہ کوئی معمولی ملک نہیں ہے اس لیے ملک کو ہمیں بچانا ہے اور یہاں اللہ کی وحدت اور اس کے دین کو باقی رکھنا ہے، تو انھوں نے حضور ﷺ کے اسوہ اور طریقہ پر پہلے یہ طے کیا کہ ہم کو بھی افراد تیار کرنا ہے اور افراد تیار کرنے کے لیے انھوں نے تین مرکز بنائے، پہلا مرکز نجیب آباد میں نجیب الدولہ کے قلعہ میں مدرسہ کی صورت میں قائم کیا اور دوسرا دائرۂ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں اور تیسرا مرکز سندھ میں ٹھٹھ کا مدرسہ تھا، جہاں مولانا معین صاحبؒ ہوتے تھے اور اس زمانے میں ایک بڑے عالم تھے۔ ان تینوں مراکز کے اندر لوگوں کو جمع کیا اور جمع کر کے ان کی تعلیم وتربیت شروع کی اور شاہ ولی اللہ نے جوان کی فکری تربیت کے قربان جایئے، فرمایا: دیکھو! اب شہنشاہیت کا دور ختم ہو رہا ہے، یہ اب لوٹنے والا نہیں ہے، اس لیے شہنشاہیت کو لوٹانے کی کوشش نہیں کرنی ہے، بلکہ اس جمہوریت کو لوٹانے کی کوشش کرنی ہے جو نبی اکرم ﷺ مدینہ پہنچ کر تکثیری سماج کے اندر میثاقِ مدینہ بنا کر قائم کی تھی اور میثاقِ مدینہ میں سب سے پہلی دفعہ مذہبی رواداری تھی۔ اس وقت میں ابراہیمی، صابی، یہودی، نصاریٰ اور مسلمان ان تمام کو ایک قوم بنا کر ایک دستور مرتب کیا تھا، اس پر گویا کہ ایک جمہوری شوریٰ مرتب ہوئی اور یہ طے پایا کہ آپس کے جو بھی معاملات اور قضیے ہوں گے وہ مشورے سے طے ہوں گے اور اگر شوریٰ سے طے نہیں ہو پائے گا تو آخری فیصلہ نبی پاک ﷺ کی جانب سے ہوگا۔

شاہ ولی اللہ کی فکر اور فکرِ ولی اللّٰہی کا ترجمان دارالعلوم دیوبند:

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی ٹھیک وہی طرز اختیار کیا چنانچہ (جیسا کہ عرض کیا گیا) ان ہی خطوط پر اپنی کوششوں اور جدوجہد کا آغاز فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سراج الدولہ ادھر بنگالہ میں لڑے، بکسر کی لڑائی میں نواب شجاع الدولہ لڑے، بریلی کے اندر نواب رحمت علی خان لڑے جو حضرت شاہ ولی اللہ کے خاص شاگرد تھے اور جنوبی ہند (south) میں نواب حیدرؒ اور ان کے بعد ان کے عظیم فرزند اور ہونہار سپوت سلطان ٹیپوؒ لڑے، لیکن (قدر اللّٰہ ماشاء) 1799ء تک یہ سب شہید ہو گئے اور پورے ملک پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، حضرت شاہ ولی اللہ انتقال فرما گئے، مگر ان کی جماعت موجود تھی، لہذا 1735ء سے آپ کے تربیت یافتہ ان حضرات نے کام کیا، آپ تاریخ پڑھیں گے، تو اس میں وہابی مومنٹ (Wahabi Moment) کا ذکر ملے گا، یہ وہابی مومنٹ وہی ہے جو 1735ء میں شاہ ولی اللہ نے قائم کیا تھا، اسی میں ہم لوگ یعنی دیوبند والے بھی ہیں، اور اسی لیے دارالعلوم دیوبند کے بارے میں یہ بات طے ہے کہ وہ فکر ولی اللّٰہی کا ترجمان ہے اور ترجمان ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو مسلکی اعتدال حضرت شاہ ولی اللہؒ نے قائم کیا تھا اسی مسلکی اعتدال سے دارالعلوم دیوبند کا خمیر گوندھا گیا ہے، اس طریقہ پر گویا کہ وہ سلسلہ چلا، خیر! حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد جب شاہ عبدالعزیزؒ کا زمانہ آیا تو شاہ صاحبؒ کی تیار کردہ جماعت کے اسباب وافر موجود تھے اور ان کے پاس شاہ ولی اللہؒ کی فکری رہنمائی بھی موجود تھی اور شاہ صاحبؒ کی تیار کردہ جماعت کی صورت میں افرادی طاقت وقوت بھی تھی۔ 1803ء میں سب سے پہلے انھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور سب سے پہلے Lebration Moment کے نام سے ایک تحریک شروع کر کے حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کو اس کا کمانڈر بنایا اور ان کے بعد حضرت شاہ اسمٰعیلؒ نے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور یہ حضرات لڑتے رہے، لڑتے رہے، یہاں تک کہ 1831ء میں شہید ہو گئے۔

اس کے بعد مولانا ولایت علیؒ اور مولانا عنایت علیؒ بھی لڑے، پھر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی اپنے دور میں لڑے اور پھر اس جہادِ آزادی کو آگے بڑھانے کے لیے 1866ء میں دارالعلوم دیوبند قائم ہوا، جو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا بے مثال کارنامہ ہے۔

دارالعلوم دیوبند ملتِ اسلامیہ کا عظیم دینی وعلمی سرمایہ ہے

اس جماعت کے سرخیل کی حیثیت حضرت شاہ حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کو حاصل تھی اور اس کے ہراول دستے میں حافظ ضامن شہید، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی شامل تھے۔ جب 1857ء میں انگریزی حکومت کے خلاف برپا نے ہونے والے عوامی انقلابات بظاہر ناکام ہوگئے اور خود حضرت نانوتوی اور ان کے دیگر ساتھیوں کو بھی انگریزی فوج کے ساتھ دوبدو کی جنگ میں اسباب ووسائل اور افراد کی قلت کی وجہ سے پیچھے ہٹنا پڑا اور اس طرح گویا سارے متحدہ ہندوستان پر برٹش حکومت کا جھنڈا لہرانے لگا تو اس کے نتیجے میں ہندوستان کے تعلیمی وتہذیبی شعبوں میں پہلے سے جاری ترمیم وتحریف کا سلسلہ مزید مضبوط ہوتا چلا گیا، عیسائی مشنریز کی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں اور ایسا لگنے لگا کہ آیندہ چند سالوں میں ہی نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی وجود ختم ہوجائے گا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علمی، فکری، تہذیبی، سماجی اور مذہبی شعبوں میں بھی انھیں افلاس وتہی دستی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ایسے نازک وقت میں فکرِ ولی اللّٰہی کے ان ہی پاسبانوں نے مغربی یوپی کے ایک معمولی قصبہ 'دیوبند' میں ایک عربی اسلامی مدرسہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا، اس منصوبے کی تشکیل وتعبیر میں شریک تمام لوگ حب الوطنی کے جذبے کے ساتھ ایمان وایقان اور خلوص وللّٰہیت کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس منصوبے کو ایک فکر، ایک تحریک اور دعوت و پیغام کی شکل دینے میں اہم رول ادا کیا۔

پھر یہ ادارہ جو اولِ دن انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں قائم کیا گیا اور اس کا

مکمل انحصار یہاں کے مسلمانوں کے مخلصانہ تعاون وامداد پر تھا، دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں اپنی دھاک بٹھانے میں کامیاب رہا، اس درس گاہ سے نکلنے والے فضلاء نے ہندوستان کی آزادی میں سرفروشانہ حصہ لینے کے ساتھ برصغیر کے علاوہ دنیا کے مختلف خطوں اور گوشوں میں اسلام کی ترویج، اسلامی تہذیب اور اسلامی افکار وتعلیمات کی اشاعت کے بے مثال کارنامے انجام دیے اور آج تک دے رہے ہیں۔ ہندوستان بھر میں قائم بے شمار دینی وعصری تعلیمی اداروں میں یہ صرف دارالعلوم دیوبند کی خصوصیت ہے کہ اس نے عوامی سطح پر مقبولیت واعتباریت حاصل کرنے کے لیے وہ تشہیری وسائل و اسباب اختیار نہیں کیے جو دوسرے اداروں کی جانب سے عام طور پر اختیار کیے جاتے ہیں، مگر اس کے باوجود آج اس کی تاسیس کو تقریباً ڈیڑھ صدی کا عرصہ ہونے کو آیا اور اس عرصے میں اس ادارے کو دنیا بھر میں جو عوامی مقبولیت وشہرت حاصل ہوئی اور اہلِ علم وفضل میں اس کا جو اعتبار ووقار قائم ہوا، وہ کسی بھی دوسرے ادارے کو حاصل نہ ہوسکا۔ اس کی وجہ اس کے بانیین کا بے مثال خلوص اور دین کی خدمت وتحفظ اور دینی علوم وافکار کی ترویج واشاعت کا بے پناہ جذبہ ہے۔ یہاں سے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، خاتم المحدثین علامہ انورشاہ کشمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور بے شمار ایسے جیالے پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے علم وفضل، فکر ونظر اور جہد وعمل سے ہندوستانی مسلمانوں کی رہبری ورہنمائی کا فریضہ بخوبی طور پر انجام دیا۔ مسلمانوں میں تعلیم و تربیت کو فروغ دینے کے لیے تدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور دیوبند کے طرز پر ہزاروں تعلیمی ادارے قائم کیے، ان کی ذہنی وفکری نشو ونما کے لیے تصنیف وتالیف سے وابستہ ہوئے اور ایک ایک فاضلِ دیوبند نے قرآن وحدیث اور اسلامی فکر وفلسفے کی تشریح پر مشتمل سیکڑوں تصانیف سے امت کو مالا مال کیا، تبلیغ کی راہ سے مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی سماجی برائیوں اور غیر اسلامی رسم ورواج اور طریقوں کو دور کرنے کی قابلِ قدر کوششیں کیں،

ادب وصحافت سے بھی اپنا رشتہ جوڑا اور عربی وار دوزبان وادب اور صحافت کی لازوال اور بے مثال خدمت کی۔ الغرض دارالعلوم دیوبند کی تاسیس 30 رمئی 1866ء-15رمحرم الحرام 1283ھ کو جن عظیم مقاصد اور منصوبوں کے تحت رکھی گئی تھی، انھیں شرمندۂ تعبیر کرنے میں اس کے فرزندوں اور فضلاء نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور تن من دھن کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی ہر ممکنہ خدمات میں مصروف وسرگرم رہے۔

دارالعلوم نے شروع سے لے کر اب تک اپنی خدمات کا دائرہ وسیع تر رکھا ہے، اس کے فضلاء اور فرزندوں کے کارنامے علوم وفنون کے شعبوں کو تو محیط ہیں ہی، مگر اس کے ساتھ ساتھ سیاست وسماج اور دوسرے شعبوں میں بھی ان کی کارکردگی بے مثال رہی ہے۔ چنانچہ علمِ تفسیر ہو یا حدیث، فقہ ہو یا منطق وفلسفہ، ادب ہو یا صحافت، تبلیغ ہو یا مناظرہ ان سارے پہلوؤں پر فضلاء دیوبند نے جو خدمات انجام دی ہیں، انھیں ہندوستانی مسلمان کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اسی طرح دیوبند کے جو فضلاء سیاست کے میدان میں آئے انھوں نے معاصر سیاست کی آلودگیوں سے بچتے ہوئے پوری دیانت داری وامانت داری کے ساتھ قوم ووطن کی خدمت کی اور اس راہ سے بھی دیوبند کی بھرپور نمایندگی کی۔ موجودہ وقت میں جبکہ پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ماحول سازی کی گھناؤنی کوششیں ہو رہی ہیں اور خود ہندوستان میں مسلمانوں کا ناطقہ بند کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں، ایسے میں جن چند اداروں اور ان کے فرزندوں سے ملتِ اسلامیہ کو امید ہے اور وہ ان سے اسلام اور مسلمانوں کے علمی ومنطقی دفاع کی توقع رکھتی ہے، ان میں دیوبند اور اس کے فضلاء بھی ہیں اور بحمد اللہ دارالعلوم دیوبند امت اور ملت کی اس امید پر کھرا اترنے کی ہر ممکن کوشش اور جتن بھی کر رہا ہے۔ رسوخ فی العلم اور اشاعت وفروغِ دین کا بے پناہ جذبہ اس کے فضلاء کو ورثے میں ملا ہے اور وہ عملی میدان میں آنے کے بعد اسی جذبے کے تحت کام کر رہے ہیں۔ بلاشبہ دارالعلوم دیوبند مسلمانوں کا عظیم الشان دینی وملی سرمایہ ہے، اس ادارے سے مسلمانوں کا ملی واجتماعی وجود وابستہ ہے۔ اس ادارے نے جدوجہد

آزادی میں بھی ہندی مسلمانوں کی بے مثال نمایندگی کی تھی اور اپنے جیالوں کو میدانِ کارزار میں اتارا تھا اور علم و دین کے تحفظ میں بھی اس کا رول نہایت ہی مضبوط اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوستان بلکہ برصغیر میں دینی تعلیم و تربیت کی جو موجودہ شکل ہے، وہ اسی عظیم الشان درس گاہ کی دین ہے۔ موجودہ پر آشوب ماحول میں بھی جو معدودے چند نفوس دنیوی حرص و ہوس سے بچتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات و ہدایات اور قرآن و سنت کی تعلیم و ترویج میں مشغول نظر آتے ہیں، وہ بھی کہیں نہ کہیں اسی دیوبند کی تحریک کا اثر ہے۔ دیوبند کی خدمات اور اس کی قربانیاں اتنی زیادہ ہیں اور اس کی تاریخ ایسی جاں فشانیوں سے عبارت ہے کہ اسے پڑھ کر تعظیم و احترام کے عمیق جذبات ابھرتے اور ان درویشانِ خدامست کے لیے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے، جنھوں نے ڈیڑھ سو سال پہلے ہی برصغیر کے مسلمانوں کے مستقبل کا اندازہ کر لیا تھا اور پھر ان کے دین و ایمان کے تحفظ کے لیے مدارس اسلامیہ کی تحریک شروع کی تھی۔ اللہ ان سب کی مخلصانہ قربانیوں کو بے پناہ قبولیتوں سے نوازے اور تمام مسلمانوں کی جانب سے انھیں خوب سے خوب تر بدلہ عطا فرمائے۔

دار العلوم دیوبند عزیمت کا نام ہے

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے ایک موقع پر فرمایا کہ دار العلوم دیوبند صرف کتابیں پڑھانے کے لیے نہیں بنایا گیا ہے، بلکہ یہ تو ایک تحریک ہے جس کے ذریعے اس ملک میں دین کا دفاع کیا جاتا رہے گا اور اسی لیے دار العلوم دیوبند کا نام عزیمت ہے، دار العلوم دیوبند رخصت کا نام نہیں ہے، اگر ہم اس ادارہ سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہیں اور یقیناً ہیں، چاہے ہم وہاں پڑھے ہوں یا نہ پڑھے ہوں، لیکن وہاں کے پڑھے ہوئے اساتذہ نے ہی ہمیں پڑھایا ہے، کہیں نہ کہیں پر روشنی وہی ہے، جب ہم مسلکِ دیوبند سے وابستہ ہیں تو آج بھی ہمارے اندر وہی عزیمت ہونی چاہیے، رخصت سے

چلنے والا نہیں ہے۔ بہر حال قصہ مختصر یہ ہے کہ ہر دور کے علمائے کرام نے بے پناہ قربانیاں پیش کیں، اپنی زندگیاں کھپادیں اور دوسری اقوام کو ساتھ لے کر اور ایک اتحاد بنا کر انگریزوں کا جم کر مقابلہ کیا اور انگریزوں کو اس ملک سے نکال کر ہی دم لیا۔

آزادی کے بعد

جب ۱۹۴۷ء میں یہ ملک آزاد ہو گیا تو بہت بڑا اور اہم ترین مرحلہ آیا کہ اس ملک کا سسٹم کیسا ہو، اگر اس وقت حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نہیں رہے ہوتے، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نہیں رہے ہوتے، حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ اور ان جیسے کئی علماء نہیں رہے ہوتے تو ہندوستان کا دستور کچھ اور بنتا، لیکن ان لوگوں نے طے کیا کہ دستور وہی بنے گا جو تکثیری سماج کے لیے موزوں اور مناسب ہو سکتا ہے اور جو مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد آپؐ نے میثاقِ مدینہ کی صورت میں بنایا تھا، لہذا یہ طے پایا کہ یہاں کے دستور میں مذہبی رواداری رہے گی اور کسی ایک مذہب کی حکومت نہیں ہوگی۔

مختلف نظریوں کی کشاکش اور مخلصانہ رہنمائی

ساورکر نے 1920ء میں گاندھی جی سے یہ کہا کہ ہندو الگ قوم ہے اور مسلمان الگ قوم ہے، ہم ایک ساتھ نہیں رہ سکتے، اس لیے شیخ الہندؒ کے مشورہ کے مطابق خلافت تحریک کے ماتحت جو تم لڑ رہے ہو، ہم تمھارے ساتھ نہیں لڑیں گے، بلکہ ہم الگ لڑیں گے اور مسلمانوں میں سے محمد علی جناح کی بھی یہی فکر تھی، چنانچہ انھوں نے کہا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہے اور ہندو ایک الگ قوم ہے، ہم تمھارے ساتھ نہیں رہ سکتے، ہم الگ پاکستان بنائیں گے، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے دونوں نظریوں کو غلط ٹھہرایا اور فرمایا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں بنتیں۔

یہ رہنمائی ہے:

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنے دور میں رہنمائی کی، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے دور میں رہنمائی کی، 1920ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے رہنمائی کی اور اب آزادی کے وقت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے رہنمائی کی، یہ رہنمائی ہمارے علماء کی گھٹی میں ہے، بلکہ یہ رہنمائی میراثِ رسول ﷺ ہے اس لیے علمائے کرام کی رہنمائی اور ان کے چراغِ ہدایت کی روشنی میں ہندوستان کا یہ دستور اور آئین بنا اور اب کچھ فرقہ پرست لوگ اس دستور کو بدل کر کچھ اور لانا چاہتے ہیں۔

اسلام میں معاہدہ کی اہمیت، اس کی بے مثال پاسداری اور ہمارا لائحۂ عمل

آپ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام میں معاہدہ کی بہت اہمیت ہے، قرآن کریم نے کہا ہے "والموفون بعهدهم اذا عاهدوا والصابرين فی البأساء والضراء وحين البأس، أولئک الذين صدقوا وأولئک هم المتقون" (البقرہ:177) رسول اللہ ﷺ کے 23 رسالہ پورے دورِ نبوت میں جتنے معاہدے کیے سب کے سب نبھائے، ایک معاہدہ بھی ایسا نہیں بتا سکتے جسے آپ نے خود توڑا ہو، چاہے کتنی ہی مشقت اور تکلیف اٹھانی پڑی ہو، چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے معاہدہ کرلیا، ابھی معاہدے پر دستخط نہیں ہوئے تھے اور حضرت ابوجندلؓ جو مکہ میں بیڑیوں میں پڑے ہوئے تھے، بیڑیوں میں گھسٹتے ہوئے حدیبیہ میں آگئے، وہ لہولہان تھے، لیکن حضور ﷺ نے فرمایا ابوجندل! واپس جاؤ، میں معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا، صحابہؓ کی آنکھوں میں خون آگیا، مگر آپ ؐ نے انھیں واپس بھیجا، یہ تھی معاہدے کی پاسداری۔ البتہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن پر آپ ؐ نے کبھی compromise نہیں کیا، اس لیے آپ کے اس حکم کو مان کر چلنا پڑے گا اور ہر حال میں معاہدہ کی پابندی کرنی پڑے گی۔

بہرحال 1947ء میں ہندوستان کی آزادی کے وقت ایک معاہدہ ہوا، اس لیے ہم نے اور ملک کی اکثر قوموں نے معاہدے کی پاسداری کی ہے، مگر آج اس معاہدہ کو توڑنے

کے لیے کچھ طاقتیں سامنے آرہی ہیں، اللہ کی قدرت ہے کہ لوک سبھا میں ان کو طاقت مل گئی ہے لیکن راجیہ سبھا میں ان کو طاقت نہیں ملی ہے، اس لیے وہ مجبور ہیں اور ابھی معاہدہ نہیں توڑ سکتے، دستور ہند کو تبدیل نہیں کر سکتے، اللہ تعالیٰ ایسے ہی مجبوری میں انھیں ختم کردے (آمین) اور چاہے گا تو کر سکتا ہے، لیکن وہ اس معاہدے کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس معاہدہ کی رو سے ہمارے پاس جمہوریت کی طاقت ہے، ہم خود سے اس معاہدہ کو نہیں توڑیں گے، ہم ہتھیار نہیں اٹھائیں گے، ہم دہشت گردی کا راستہ نہیں اپنائیں گے، جب تک یہ معاہدہ باقی ہے ہم معاہدہ کی رو سے جمہوری طاقت یعنی ووٹ کی طاقت کا استعما کریں گے اور ہم ان کو پیچھے ڈھکیلیں گے، لیکن جس دن انھوں نے اس معاہدے کو توڑ دیا، تو ہمارا ہاتھ بھی آزاد ہو جائے گا، اس کے بعد جو کچھ اس ملک میں ہوگا اس کے ذمے دار وہ ہوں گے ہم نہیں ہوں گے، یہ ہے ہمارا موقف بالکل واضح اور صاف اور موقف بالکل صاف ہونا چاہیے، یہ تو ہوا دفاعی پہلو۔

اقدامی عمل کی اہمیت

ہمارے یہاں دفاعی سے زیادہ اقدامی عمل کی اہمیت اور ضرورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دفاعی جنگیں لڑیں، مگر پوری زندگی میں ڈھائی دن ہی آپ ان جنگوں میں شریک رہے، جو دفاعی تھیں، باقی آپ نے اقدامی ہی کیا ہے، لیکن اس سے پہلے خود تیاری کی ہے، چنانچہ ابتدائے اسلام میں حضرات صحابۂ کرامؓ پر کتنی مصیبتیں آئیں، ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیے گئے، تشدد کی چکی میں پیس دیا گیا، زمین تنگ کر دی گئی، جینا دوبھر ہو گیا، یہاں تک کہ مکہ میں حالات ابتر سے ابتر ہو گئے اور پانی سر سے اونچا ہو گیا، چنانچہ سنہ 5 نبوی کا واقعہ ہے کہ حضور ﷺ کعبہ کی دیوار کے پاس حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، اب کون سا ظلم وستم باقی رہ گیا ہے، جو کچھ ہو سکتا تھا، ہم پر ہو رہا ہے، پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے، تو آپ نے فرمایا صبر کرو، اللہ کی رحمت آئے گی، اللہ کی مدد آئے

گی، تو حضرت مغیرہؓ نے کہا "متی نصر الله یارسول الله" یہ انداز اور یہ جملہ ایک صحابی استعمال نہیں کرسکتا تھا، لیکن وہاں استعمال کرنے کا معنی یہ ہے کہ پانی سر سے اونچا ہوگیا تھا، پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا تھا، لیکن آپ ان کے سامنے جھکے نہیں، بلکہ آپ نے فرمایا "کفوا أیدیکم و أقیموا الصلوة" ابھی وقت نہیں آیا ہے، ابھی تیاری کرنا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ تیرہ سال تک تیاری ہوگی، ابھی تو پانچ ہی سال ہوئے ہیں، ابھی آٹھ سال اور سہنا ہے اور تیاری کرنی ہے۔

افرادسازی کے لیے نماز اور صبر سے بہتر کوئی عمل نہیں

ہاتھ کو روکو اور نماز کا اہتمام کرو، اس لیے کہ اخلاقی اور انسانی کمالات اگر انسان میں پیدا ہوسکتے ہیں تو وہ صرف نماز اور صبر کے ذریعے ہوسکتے ہیں، اس کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں، صبر و نماز سے حاصل ہونے والی روحانی قوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیرہ سال میں افراد تیار ہوگئے اور آپ کی حیاتِ مبارکہ میں ۱۱ھ تک صرف دس سال کے مختصر عرصے میں دس لاکھ مربع میل کے رقبہ پر اسلام پھیل گیا اور پھر حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت تک دنیا کے ایک تہائی حصہ میں اسلام پھیل گیا اور جب سنہ 40ھ میں خلافتِ راشدہ کی تکمیل ہوئی تو نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر یعنی مصر سے چائنا تک اسلام پھیل گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ترقی دینا چاہتے ہیں تو اس کے لیے مشکل حالات پیدا کرتے ہیں، اس لیے کہ اچھے افراد کی تیاری مشکل حالات میں ہوتی ہے، عیش میں نہیں ہوتی، اسی لیے حضرات صحابۂ کرام نے مشکل حالات میں جو کارنامے انجام دیے ہیں آج ان آسایش کے حالات میں ہمارے بس کا نہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ مشکل حالات ہمارے لیے اتارے ہیں، ہم کو موقع دیا ہے کہ ہم بھی اسی طرح کوشش کریں۔

فکری رہنمائی قرآن وحدیث سے حاصل کریں

لہذا ہم پوری طاقت وصلاحیت قرآن وحدیث پر لگائیں اور فکری رہنمائی کے

لیے تو وحی ہی ہے، ایک قرآن دوسرے حدیث، ایک وحیِ متلو اور دوسری وحیِ غیر متلو اور عملی رہنمائی کے لیے سیرتِ رسول ﷺ ہے اس لیے نبی کریم ﷺ کی سیرت وحدیث ایک ایک مسلمان تک پہنچانے کی کوشش کریں، آج صورت حال یہ ہے کہ سو میں چار بچے قرآن پڑھ رہے ہیں اور چھیانوے باہر ہیں، سو میں سے باون اسکول میں پڑھ رہے ہیں، ان کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کا کوئی نظام ہمارے پاس نہیں، آپ بغیر قرآن پڑھائے اسکول بھیج رہے ہیں اور وہاں وہ گیتا کو لازم کر رہے ہیں، قرآن صبغۃ اللہ ہے، اگر ہم قرآن پڑھا کر بھیج دیں گے تو کتنا گیتا پڑھادیں اس کا رنگ نہیں بدلے گا، لیکن اگر قرآن کے بغیر ہم بھیج دیں گے تو وہاں سے وہ گیتا کا رنگ لے کر گھر واپس آئے گا، اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں اس کو روکنے کے لیے کیا کردار ادا کرنا ہے، ہم کو اس وقت تعلیم وتربیت اور مکاتب کے نظام پر بھرپور توجہ دینی ہے، بلکہ پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے پڑنا ہے کہ ہم اس کو ایک ایک گھر میں پہنچادیں اور یہ طے کرلیں کہ میرا کوئی بچہ قرآن سے محروم نہ رہے، ہم کو یہ عہد کرنا ہے کہ اگر یہ لوگ دس سال، بیس سال میں یہ چاہتے ہیں کہ دس کو بگاڑ دیں، تو ہم سو کو پڑھا کر ان کی کوششوں کو رائیگاں کردیں گے۔

تعلیم وتربیت اور تزکیہ کی اہمیت

اور بڑی قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ہر کام معروضی انداز میں کیا ہے، آپ نے ہر کام مثبت کیا ہے، منفی قدم کبھی نہیں اٹھایا، اس لیے اپنی اپنی جگہوں پر فکر کریں اور سوچیں اور ہم کو دونوں پہلوؤں پر توجہ دینی ہے۔ تعلیم پر بھی اور تزکیہ پر بھی۔ آپ تو سارے علماء ہیں کیا بتاؤں! سنہ 1 نبوی سے آپ نے کام شروع کیا، اس وقت لوگوں کو پتہ نہیں چلا، سنہ 2 نبوی میں کام پھیل گیا، پھر سنہ 3 نبوی میں بات اور پھیل گئی، تو مکہ میں ان کا دار الندوہ زندہ ہوگیا، جو مشرکین کی پارلیمنٹ تھی اور آپ کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں، تو اللہ تعالیٰ نے سنہ 3 نبوی میں آپ کی مدد کے لیے سورۂ مزمل کا پہلا رکوع اتارا اور

اس میں تہجد کا حکم آیا"إن ناشئة الليل هي أشدو طأو أقوم قيلا" پچھلے پہر کے اس روح پرور وقت میں دل اور دماغ دونوں ایک ساتھ ہوتے ہیں، 24 گھنٹہ میں دل دماغ الگ کام کرتا ہے اور دل الگ کام کرتا ہے۔ جب تک دل اور دماغ ایک ساتھ نہ ہوں آپ قیادت نہیں کر سکتے۔ دماغ طاقت ور ہونا چاہیے اور ضمیر روشن ہونا چاہیے، اس لیے "در مدرسہ خانقاہ دیدم" جب تک مدرسہ میں خانقاہ نہیں ہوگی تب تک بات نہیں بننے والی۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد حضور ﷺ نے ایک حلقہ علم کا قائم کیا اور ایک حلقہ ذکر کا قائم کیا، تاکہ تعلیم وتربیت دونوں کا نظام قائم ہوں اور دونوں ہی ضروری ہیں۔

آگ لگی ہے. بجھانے کے لیے دوڑ پڑو

اس لیے دونوں نظاموں کو مضبوط کرنے کے لیے ہم میں سے جس کو اللہ تعالیٰ نے جتنی صلاحیت دی ہو وہ اللہ کے دین کے پیچھے لگادیں، انتظار نہ کریں، اگر گاؤں میں کسی کے گھر میں آگ لگی ہو تو اس وقت میٹنگ کر کے آدمی بلائے نہیں جاتے بلکہ بالٹی اور لوٹا لے کر ہم خود دوڑ پڑتے ہیں، البتہ ہم آواز دیتے ہیں کہ آگ لگی ہے اگر کسی کو آنا ہے تو آؤ، لہذا اس وقت انتظار نہیں کرنا ہے کہ تنظیم ہوگی، کمیٹی بنے گی، بلکہ ہر ایک اپنی صلاحیت کے مطابق کوشش شروع کر دے اور دوڑ پڑے، البتہ آواز ضرور دیتا جائے، ان شاء اللہ اگر ہم یہ کریں گے تو اس ملک میں درخت کو پوجنے والا ہم کو پوجنے لگے گا۔

ایک مزیدار سبق آموز قصہ

سنہ 2002ء کی بات ہے، گجرات میں فسادات جاری تھے، ہمارے یہاں اشوکا ہوٹل (Ashoka Hotel) ہے، وہاں ایم بی سی (M.B.C) والوں کی میٹنگ تھی، میں بھی اس میں شریک تھا، جب ہم وہاں سے فارغ ہوئے تو عصر کا وقت قریب بہ ختم تھا، مجھے ڈر لگا کہ کہیں عصر کی نماز قضا نہ ہو جائے، میں نے مزار کے قریب کھلی جگہ پا کر عصر کی نماز ادا کر لی، میرے ساتھ ایک عالم تھے، نماز سے فارغ ہو کر جب ہم جانے لگے، تو مجاور

نے پہچان کر چائے نوشی کے لیے بٹھالیا، اس دوران تین چار غیر مسلم آئے اور مزار پر سجدہ کرنے لگے، جب سجدہ کر کے جانے لگے تو مجاور نے ان کو بھی چائے نوشی کے لیے بٹھالیا، میرے خیال سے وہ آتے جاتے ہوں گے، ہم سب چائے پینے لگے، میرے ساتھ جو مولانا صاحب تھے ان سے نہیں رہا گیا اور انھوں نے غیر مسلموں سے کہا: اے سنو! گجرات میں تو مجھ کو قتل کر رہے ہو اور یہاں مجھے سجدہ کر رہے ہو تو اس نے بہت اطمینان سے جواب دیا کہ مولانا صاحب! سنیے جو آدمی یہاں لیٹا ہوا ہے، اگر آپ بھی ویسے ہی بن جاؤ تو میں آپ کو بھی سجدہ کرنے لگوں گا۔

خطرات کے ساتھ ہمت سے کام کرنے کی ضرورت

اس لیے قرآن کریم میں ہے "لتبلون في أموالم وأنفسكم ولتسمعن من الذين أوتوالكتاب من قبلكم ومن الذين أشركواأذى كثيراوأن تصبرواووتتقوافإن ذلك من عزم االأمور" جان بھی خطرہ میں ہے، مال بھی خطرہ میں ہے، یہود ونصاریٰ بھی ہماری دل آزاری کی باتیں کر رہے ہیں اور مشرکین بھی کر رہے ہیں، روزانہ سخت بیانات آرہے ہیں، اب یہی دوراستے ہیں، صبر اور تقویٰ یعنی غور وفکر کرو اور اعمال بھی درست کرو، یہی ہمت والا کام ہے۔

ہم نے حضرت (رئیس الجامعہ مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی زید مجدہم) کی سرپرستی میں یہ گفتگو کی ہے، اللہ تعالیٰ اس نیک بندہ کے طفیل ہماری گفتگو کو قبول فرمائیں اور پورے حوصلہ کے ساتھ یہ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

اقتباس

جب تک دل اور دماغ ایک ساتھ نہ ہوں آپ قیادت نہیں کر سکتے۔ دماغ طاقت ور ہونا چاہیے اور ضمیر روشن ہونا چاہیے، اس لیے ''در مدرسہ خانقاہ دیدم'' جب تک مدرسہ میں خانقاہ نہیں ہوگی تب تک بات نہیں بننے والی۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد حضور ﷺ نے ایک حلقہ علم کا قائم کیا اور ایک حلقہ ذکر کا قائم کیا، تاکہ تعلیم و تربیت دونوں کا نظام قائم ہوں اور دونوں ہی ضروری ہیں۔

اس لیے دونوں نظاموں کو مضبوط کرنے کے لیے ہم میں سے جس کو اللہ تعالی نے جتنی صلاحیت دی ہو وہ اللہ کے دین کے پیچھے لگا دیں، انتظار نہ کریں، اگر گاؤں میں کسی کے گھر میں آگ لگی ہو تو اس وقت میٹنگ کر کے آدمی بلائے نہیں جاتے بلکہ بالٹی اور لوٹا لے کر ہم خود دوڑ پڑتے ہیں، البتہ ہم آواز دیتے ہیں کہ آگ لگی ہے اگر کسی کو آنا ہے تو آؤ، لہذا اس وقت انتظار نہیں کرنا ہے کہ تنظیم ہوگی، کمیٹی بنے گی، بلکہ ہر ایک اپنی صلاحیت کے مطابق کوشش شروع کر دے اور دوڑ پڑے، البتہ آواز ضرور دیتا جائے، ان شاء اللہ اگر ہم یہ کریں گے تو اس ملک میں درخت کو پوجنے والا ہم کو پوجنے لگے گا۔

Rahi Printers, Surat (M.: 78745 99466)